وجودیت کے تناظر میں 'سرنگ' کا مطالعہ

شائستہ شریف
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ کالج برائے خواتین گلبرگ، لاہور

THE TUNNEL AND EXISTENTIALISM

Shaista Sharif
Assistant Professor of Urdu
Govt. College for Women, Gulberg, Lahore

Abstract

Latin America largely remained Spanish colony for over three centuries. Argentina compared to other Spanish colonies is an advanced country, facing challenges associated with modern life style. The paper studies and evaluates the basis Ernesto Sabato employ to highlight the isolation, alienation and absurdity of a modern man in his novel 'The Tunnel'. The novel is grounded in the colonial past of Argentina, conditions of settler colonialism, modernism and French philosophy and wisdom. It concludes that among the abundance of material resources and ideologies of 20th century, individuality of a person and its existence is facing an existential threat.

Keywords:

ارنستو سباتو، سارتر کامیو، آصف فرخی، ایل ٹنل، ارجنٹینا، امریکہ، نوآبادیات، وجودیت، سرنگ

ارجنٹینا کے ناول نگار ''ارنستو سباتو'' کا ناول ''ایل مٹل'' کے نام سے ۱۹۴۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ''ایل مٹل'' کو انگریزی ترجمے ''دی مٹل'' کے ذریعے سے آصف فرخی صاحب نے ''سرنگ'' کے عنوان سے اُردو کے قالب میں ڈھالا جو پہلی مرتبہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ ناول کی طرف بڑھنے سے قبل ارجنٹینا کی تاریخ اور ارجنٹینا میں ناول کی روایت کا مختصر سا جائزہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ارجنٹینا لاطینی امریکہ میں جدید طرزِ زندگی کا حامل ایسا ملک ہے جس کی ۸۰ فیصد آبادی شہروں میں مقیم ہے، اکثریت (تقریباً ۹۰ فیصد) سفید فام اور شرح خواندگی ۹۵ فیصد ہے۔(۱) مؤرخین نے ارجنٹینا کے پہاڑی، ساحلی اور میدانی علاقوں میں قبل کولمبیائی قبائل کی موجودگی کا ذکر کیا ہے جو اپنی مقامی معاشرت، طرزِ زندگی، رسوم و رواج اور روایات کے حامل تھے جنھیں نوآبادیاتی تعصب نے کبھی تاریخ کا حصہ نہ بننے دیا۔ ارجنٹینا میں آبادی کا حالیہ تناسب نوآبادکاروں کے ظلم و ستم اور قتل و غارت کی طرف واضح اشارہ ہے۔ لاطینی امریکہ میں انڈینز کے حوالے سے انھوں نے ہر جگہ اِسی حکمت عملی کو ترجیح دی کہ ''جہاں کہیں انڈین نوآبادکاری کے لیے مفید تھے وہ موجود رہے اور جہاں کہیں وہ رکاوٹ بنے یا کم اہم تھے وہ غائب ہو گئے۔''(۲) ارجنٹینا میں نوآبادیاتی دور میں مزاحمت پر ڈٹے ہوئے قبائل کو طاقت کے ذریعے کچل دیا گیا یا وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا جب کہ پُرامن لوگوں کو غلام بنا لیا گیا جنھیں ناکافی خوراک، غیر انسانی مشقت، وباؤں اور اجتماعی خودکشی نے نقصان پہنچایا۔ اسپین سے علیحدگی کے بعد بھی ارجنٹینا کے سفید فام حکمرانوں نے مقامی قبائل اور مخلوط النسل آبادی کو قومی تشکیل سے باہر رکھنے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا۔ ''۱۸۷۵ء میں نوآبادیاتی مفادات پر بڑھتے ہوئے حملوں کے جواب میں وزیرِ جنگ الفانسو السینا (Alfonso Alsina) نے نوآبادیات کو قلعہ بند کیا اور ایک بڑی خندق کھودی جو وسیع و عریض سرحد کے ساتھ ساتھ تقریباً ۲۵۰ میل وسعت کی حامل تھی جس نے وفاقی حکومت کے علاقے سے مابُوچی انڈینز کو جُدا کیا۔''(۳)

جب کہ ۱۸۷۸ء میں نئے وزیرِ جنگ حولیو ارجنٹینو روکا (Julio Argentino Roca) نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے جو حکمتِ عملی اختیار کی اِس کا اندازہ اُس کے اِس بیان سے ہوتا ہے:

> ''طاقت ور افراد کے طور پر ہماری عزتِ نفس ہم پر فرض عائد کرتی ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، دلیل کے ذریعے یا طاقت کے ذریعے اِن مُٹھی بھر وحشیوں جو ہماری دولت کو تباہ و برباد کرتے ہیں اور قانون کی عمل داری، ترقی اور ہماری اپنی حفاظت کے لیے جمہوریہ کی زرخیز ترین زمینوں پر حتمی قبضے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں کو دبا دیا جائے۔''(۴)

اِس حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مقامی باشندوں کو اِس قدر پیچھے دھکیلا گیا کہ وہ یورپی اور امریکی تاریخوں سے بھی غائب ہو گئے۔

قبل کولمبیائی معاشرے میں الپاکا، گوناکو اور لاما جیسے جانور اینڈیز کے پہاڑوں، چاکو جنگلات اور پامپا کے میدانوں میں پائے جاتے تھے۔ ذاتی جاگیر کا تصور ناپید تھا، زمین گروہی بنیادوں پر کاشت کے لیے دی جاتی، مکئی اور آلو جیسی فصلیں، جانوروں کے شکار اور ماہی گیری سے اُن کی غذائی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ یہ قبل کولمبیائی معاشرہ طبقاتی تقسیم سے مبرا مساوات پر مبنی تھا۔ نوآبادکاروں نے مقامی لوگوں کو بے دخل کرتے ہوئے زمینوں پر قبضہ کیا، زمین کو ذاتی ملکیت قرار دے کر مقامی باشندوں کو غلام بنالیا، جسمانی قوت پر انحصار کرنے والے قبائل میں گھوڑے کی صورت میں طاقت کا ذریعہ متعارف کروایا، محض غذائی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہوئی فصلوں پر اکتفا کرنے کی بجائے تجارتی اجناس کا بیج بویا۔ ''زیادہ اہم یہ کہ متعارف کردہ فصلوں اور مویشیوں کے ذریعے نہ صرف فاتح افواج اور نوآبادیاتی آبادی کی مدد کی بلکہ کراس بائی (Crosby) کے مطابق نئے یورپ (نوآبادکاروں کی آبادیوں) نے مقبوضہ زمینوں کے پورے ماحول کو اِس طرح بدل دیا کہ اِس سے لازمی طور پر مقامی لوگوں کو نقصان پہنچا اور مقامی فلورا اور فانا جس پر اُن کی ثقافت (اور بعض اوقات اُن کی زندگیاں) منحصر تھی کو خطرے میں ڈال دیا۔''(۵)

اِن اقدامات سے ایک طرف اِس غیر طبقاتی معاشرے میں ذاتی ملکیت، طاقت اور سرمائے کے ذریعے طبقاتی تقسیم کا تصور متعارف کروایا تو دوسری طرف یہاں کے ماحول اور ثقافت کو مسخ کرتے ہوئے اُس پر یورپی متن تحریر کر دیا۔

انتشار، بدامنی، انتہاپسندی، تشدد اور آمریت جیسے مسائل کا سابقہ یورپی نوآبادیات کو رہا ہے اِن مسائل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر اِن کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ برِصغیر میں صدیوں سے ساتھ رہتی ہوئی اقوام میں نوآبادیاتی حکمرانوں نے جس نفرت اور انتشار کا بیج بویا وہ آزادی کے بعد بھی بدستور پنپتا رہا۔ ارجنٹینا میں آزادی کے حصول کے ساتھ ہی بیونس آئرس اور دوسرے صوبوں کے مابین کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ مرکز پسند اور وفاق پسند گروہوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی میں مینویل روزاز (Manuel Rosas) جیسے طاقت ور اور آمریت پسند حکمران وقتاً فوقتاً مسندِ اقتدار پر براجمان ہوتے رہے تاہم ارجنٹینا میں انتہاپسندی، انتشار اور آمریت کا تعلق مابعد نوآبادیاتی صورتِ حال سے زیادہ آبیرین وراثت کے ساتھ منسلک ہے کیونکہ یہاں نوآبادیاتی نظام، مستقل نوآبادیات کی شکل میں قائم ہوا جس میں مابعد نوآبادیات کی مانند مابعد مستقل نوآبادیات جیسی کوئی صورت نہیں۔ ارجنٹینا کے مصنف حوان باتستا البرڈی کے یہ الفاظ اسپین سے علیحدگی کے بعد مستقل نوآبادیات کے تسلسل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

> ''خود کو یورپی تہذیب سے سرفراز کرتے ہیں جس کے لیے ہمارے پرانے آقاؤں نے انکار کیا۔ اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے جو اُن کے نظام کا جوہر تھا انھوں نے ارجنٹینا کو

صرف ایک بندرگاہ دی اور ہم حبُ الوطنی کے نام پر نوآبادیاتی نظام کی صرف مخصوص صورت ہی بچا سکے۔مزید کوئی اخراج یا کوئی بندش نہیں، کسی بھی عذر/ تاویل جس کا آبائی زمین کے نام پر واویلا کیا جائے کی کوئی گنجائش نہیں۔''(٦)

اِس عبارت میں ایک طرف ارجنٹینا خصوصاً بیونس آئرس کو یورپی تہذیب کا گہوارہ بنانے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے تو ساتھ ساتھ اقتدار پر غلبے کی وہ آرزو بھی موجود ہے جس نے مستقل نوآبادکاروں کو اسپین سے علیحدگی کی طرف دھکیلا۔

ارجنٹینا میں نوآبادیاتی دور میں سیاسی، معاشرتی اور انتظامی حوالوں سے سلطنتِ اسپین کے نمائندوں کو برتر مقام حاصل تھا حتیٰ کہ ارجنٹینا میں جنم لینے والے یورپی النسل باشندے (Creol) بھی اعلیٰ حکومتی اور انتظامی عہدوں سے محروم رہتے انھیں فیصلہ سازی کے عمل سے باہر رکھا جاتا جب کہ مخلوط النسل افراد اور انڈینز کو تو معاشرے کی تلچھٹ تصور کیا جاتا۔اسپین میں جنم لینے اور تعلیم و تربیت پانے والے افراد ہی حکومتی اور انتظامی عہدوں کے اہل سمجھے جاتے تھے یہی سوچ اسپین سے آزادی کے بعد نسلی برتری کی صورت میں ارجنٹینا کے معاشرے میں موجود رہی۔''نوآبادیاتی اصل کا ایک رائج عقیدہ یہ تھا کہ صرف پُرانے خاندانی افراد ہی حکومت کرنے یا انتظامی عہدہ سنبھالنے کے اہل تھے۔''(٧) جنوبی امریکہ کی جنگِ آزادی کے ہیرو سائمن بولیور کے یہ الفاظ نہ صرف مستقل نوآبادیاتی نظام کے نوآبادیاتی نظام سے جدا ہوتے ہوئے راستوں کا تعین کرتے ہیں بلکہ مستقل نوآبادکاری کی پیچیدہ صورتِ حال کو بھی بیان کرتے ہیں:

''ہم نہ ہی یورپی ہیں اور نہ ہی انڈین لیکن مقامی اور ہسپانویوں کے درمیان کی ایک مخلوط نسل، پیدائشی طور پر امریکی اور قانونی لحاظ سے یورپی ہونے کی حیثیت سے بیک وقت مالکانہ حقوق کے لیے مقامی باشندوں سے لڑتے ہوئے اور حملہ آوروں (ہسپانویوں) کے خلاف اپنی جائے پیدائش میں اپنے وجود کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم خود کو دوہری کشمکش میں گھرا پاتے ہیں۔لہٰذا ہماری حالت سب سے زیادہ غیر معمولی اور پیچیدہ ہے۔''(٨)

مذکورہ بالا عبارت میں دھرتی کے اصل باشندوں کی عدم موجودگی اُن کے آئندہ لائحہ عمل میں مستقل نوآبادیات کے ایجنڈے کو ظاہر کرتی ہے۔

ارجنٹینا میں اُنیسویں صدی کے نصف اواخر سے بڑی تعداد میں غیر ملکیوں کی آمد اور تجارت پر اُن کے غلبے نے حسب نسب کی جگہ دولت کو دے دی۔اِسی دور میں تاجروں، مزدوروں اور تارکینِ وطن پر مبنی افراد پر مشتمل ایک نیا متوسط طبقہ وجود میں آیا جس نے ارجنٹینا کی گزشتہ سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال کو خاصا متاثر

کیااوراس کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے کی حمایت یافتہ انقلابی پارٹی (Radical Party)اور سوشلسٹ پارٹی وجود میں آئی تاہم اِس تبدیلی سے بھی مجموعی طور پر ارجنٹینا کے سیاسی مزاج پر خاطر خواہ اثرات ظاہر نہ ہوئے۔ جس آمرانہ طرزِ حکومت کا راج اُنیسویں صدی میں تھا وہی بیسویں صدی میں بھی موجود رہا۔''۱۹۳۰ء اور ۱۹۸۳ء کے درمیان ۱۴ عسکری صدور نے بار بار بغاوتوں کے ذریعے اور عدلیہ اور مقنّنہ دونوں کو تہہ و بالا کرتے ہوئے ارجنٹینا کے اقتدار پر قبضہ کیا۔ جب جب اداروں کو اہلِ اقتدار کے راستے کی رکاوٹ سمجھا گیا تب تب انھیں نظر انداز کیا گیا اُن میں ترمیم کر دی گئی یا اپنے فائدے کے لیے اُن سے سازباز کر لی گئی۔''(۹)

مابعد نوآبادیاتی معاشروں میں اشراف کا ایک ایسا ہی گروہ دِکھائی دیتا ہے جس کا مقصد ملک وقوم سے زیادہ اپنے مفادات کا تحفظ قرار پاتا ہے اور اس مقصد کی تکمیل میں کمزور جمہوریت، آمرانہ طرزِ حکومت، موم کی ناک ادارے اور حکمرانوں کی بالائے قانون سرگرمیاں اُن کی مدد کرتی ہیں۔ اگر چہ ایک مستقل نوآبادیاتی معاشرہ ہونے کی بدولت ارجنٹینا میں مابعد مستقل نوآبادیات کی اُمید نہیں کی جا سکتی مگر مابعد نوآبادیاتی صورتِ حال اُسی طرح موجود ہو سکتی ہے جس طرح ایسے معاشروں میں نوآبادیات اور مستقل نوآبادیات کی بیک وقت موجودگی ممکن ہے۔''نوآبادیاتی اور مستقل نوآبادیاتی صورتیں مستقل ایک دوسرے میں سرایت کرتی اور مختلف طریقوں سے متجاوز کرتی ہیں۔''(۱۰) ارجنٹینا میں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یہ صورت موجود رہی۔ اُنیسویں صدی کے اوائل میں اسپین سے آزادی کے بعد مستقل نوآبادیاتی صورتِ حال برقرار رہی، نوآبادیات میں ردِ نوآبادیات کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے مگر مستقل نوآبادیات میں یہ ممکن نہیں چونکہ مستقل نوآبادیات میں نوآبادکاروں کی اکثریت، مستقل قیام زمین اور وسائل پر مستقل قبضے کے ساتھ ساتھ سیاسی طاقت اور اقتدار بھی ضروری ٹھہرتا ہے لہٰذا ارجنٹینا جیسے معاشرے میں جہاں کبھی نوآبادیات اور مستقل نوآبادیات بیک وقت موجود تھیں، مستقل نوآبادیات کی تکمیلی حالت کی طرف مسلسل حرکت پذیری ملتی ہے۔

ارجنٹینا خصوصاً بیونس آئرس میں بڑی تعداد میں تارکینِ وطن کی موجودگی نے مستقل نوآبادکاروں کے لیے کافی پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ ایک طرف کریول اکثریت خطرے میں پڑ گئی تو دوسری طرف قومی شناخت کے مسائل پیدا ہوئے۔ بیونس آئرس معاشی خوشحالی سے مستفید ہوتے ہوئے یورپی تہذیب کا گہوارہ بن گیا جس نے فرد کو تنہا اور اس کی زندگی کو لایعنیت کا شکار بنا دیا۔

ارجنٹینا میں ناول کی روایت

ارجنٹینا میں ناول کی روایت کے پسِ منظر میں ''مستقل نوآبادیات''(Settler Colonialism) کے تقاضے متحرک رہے ہیں۔ سائمن بولیور نے پیدائشی طور پر امریکی اور نسلی اعتبار سے یورپی ہونے کی جس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے اُنیسویں صدی کا ناول اُسی گتھی کو سلجھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ نوآبادیاتی ماضی

کے حامل ممالک کا مابعد نوآبادیاتی ادب نوآبادکاروں کے تشکیل کردہ بیانیوں کو تہہ و بالا کرتے ہوئے اپنی تاریخ کی تشکیلِ نو کرتا ہے تاکہ ماضی کو نوآبادیاتی جبر سے آزاد کروا سکے جب کہ مستقل نوآبادیات کسی مابعد صورتِ حال کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے یہاں ناول میں ''مستقل نوآبادیاتی نظام'' کو استقلال دینے کے لیے مقامی باشندوں پر غلبے اور قبضے کی تاریخ کو اپنی مرضی کے معنی پہنائے گئے۔نوآبادیات غیر ملکی اقلیت کے مقامی اکثریت پر سیاسی اور انتظامی اقتدار کا نام ہے جب کہ ''مستقل نوآبادیات'' نوآبادکار کی طرف سے مقامی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے عمل پر مبنی ہے۔نوآبادیات ثقافتی اور نسلی برتری کے بیانیے کو فروغ دے کر مقامی اکثریت کو احساسِ کمتری کا شکار کرتی ہے اور پھر انھیں ''مہذب'' بنانے کے پروگرام پر عمل کا آغاز کرتی ہے جب کہ مستقل نوآبادیات مقامی ادب اور ثقافت کا سرے سے انکار کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کی نسل کشی پر اپنی آبادیوں کا تحفظ یقینی بناتی ہے۔

ارجنٹینا کے ناول نگاروں نے بھی نوآبادکاری کے اِسی غیر منصفانہ عمل کو جواز مہیا کرنے کے لیے جو بیانیہ تخلیق کیا اُس میں تاریخی واقعات کو اپنی منشا اور پسند کے معانی پہنائے گئے۔نوآبادکاروں کی آمد سے قبل بھی ارجنٹینا کے مقامی قبائل کا جمالیاتی احساس اور تخلیقی قوتیں کسی نہ کسی صورت اظہار پاتی رہیں۔اُن کی اساطیری روایتیں اور سینہ بہ سینہ چلتی کہانیاں مقامی تہذیبوں کی ادبی روایت کی شاہد ہیں۔چونکہ یہ ادبی روایت یورپی اصنافِ ادب کے کسی معیار پر پوری نہیں اُترتی تھیں لہٰذا اِسے نوآبادیاتی اذہان نے ادبی تاریخ سے خارج کر دیا۔نوآبادکار جہاں مُلک پر قبضہ کرتا ہے وہیں مقامی باشندوں کی تمام ثقافتی علامتوں کو بھی تہہ و بالا کرنے کی کوشش کرتا ہے ارجنٹینا کی زبانی ادبی روایت کو بھی اسی رویے کا سامنا کرنا پڑا۔''نوآبادیاتی طاقتوں نے یہ برتری اُس پدری نظام کے ذریعے قائم کی جو تحریری صورتوں کو زبانی روایت پر ترجیح دیتا تھا۔''(۱۱)

گویا ارجنٹینا کی قبل کولمبیائی ادبی روایت یورپی تحریر کے جبر کی نذر ہو گئی۔نوآبادیاتی دور میں مہم جوؤں نے اپنی موجودگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے مقامی تہذیبوں اور مقامی لوگوں کے رسوم و رواج کے متعلق واقعات رقم کرتے ہوئے انھیں وحشی اور غیر مہذب قرار دیا۔شاہِ اسپین کو لکھے گئے خطوط میں یہاں کے قدرتی حسن و خوب صورتی اور سونے چاندی کے ذخیروں کی موجودگی کو بیان کیا انھی خطوط، ڈائریوں اور واقعات نے مستقبل میں ناول کو مقامی رنگ فراہم کیا۔

دیگر لاطینی امریکی ممالک کی طرح ارجنٹینا کی نوجوان نسل بھی آزادی کے وقت یورپی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب تھی، انقلابِ فرانس اور مابعد انقلاب کے منظر نامے سے آشنا تھی اور روشن خیالی کے منشور سے متاثر ملک کی سیاسی جہت کے تعین میں دلچسپی رکھتی تھی۔انھی روشن خیال نوجوان دانشوروں نے مئی ایسوسی ایشن کے نام سے ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی (۱۲) جس کے ارکان نے ارجنٹینا میں ناول نگاری کے

آغاز میں اہم کردار ادا کیا۔اس تنظیم کی سیاسی جہت روزاز مخالف خیالات پر مبنی تھی لہٰذا جلد ہی اس کے ارکان کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ان جلاوطن لوگوں میں دانشور اور ادیب بھی شامل تھے جنھوں نے جلاوطنی کے بعد دوسرے ممالک میں اپنی ادبی اور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں یوں ارجنٹینا کے ناول کی زیادہ تر خصوصیات دوسرے ممالک میں متشکل ہوئیں۔"یہ تمام ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ارجنٹینا کے ناول نے ارجنٹینا کے باہر شکل اختیار کی اور یہ آمر حوان مینویل دی روزاز کے تعلیم یافتہ نوجوان نسل پر زبردستی سیاسی جلاوطنی لاگو کرنے کے نتیجے میں ہوا۔"(۱۳)

انقلاب فرانس کی شاہد اور اُس سے متاثر یہ نوجوان نسل یورپی نمونے پر ارجنٹینا میں جدیدیت کو فروغ دینا چاہتی تھی۔نوآبادیاتی ممالک کا یہ المیہ رہا ہے کہ ایک طرف یورپی تسلط سے آزادی کی خواہش اور اس خواہش کی تکمیل اور دوسری طرف آزادی کے بعد بھی یورپی معیاروں کی تقلید اور اُسی یورپی علم وفکر کی طرف رغبت ظاہر کی جاتی ہے۔مستقل نوآبادیات کی حیثیت سے ارجنٹینا کے پاس تو یورپی رنگ اختیار کرنے کی اور بھی وجوہات تھیں۔

ارجنٹینا میں اِس دور کا سب سے اہم ناول ویسنتے فیدل لوپیز (Vicent Fidel Lopez) کا لانوویا دی اریخے (La novia de hereje) ہے۔یہ ہسپانوی امریکہ کا پہلا ناول ہے جس میں بڑے شہروں کے منظرنامے کو ادب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ناول میں "ماریا اور ہنڈرسن" اور "جوہنیتا اور وردریک" کا وصال اس خواہش کی تمثیل ہے جو بیونس آئرس کی اشرافیہ جدید ارجنٹینا اور اینگلوسیکسن سرمایہ داریت میں اتحاد کے حوالے سے رکھتی تھی۔(۱۴) بیونس آئرس کی اشرافیہ اُن مستقل نوآبادکاروں پر مشتمل تھی جنھوں نے مقامی باشندوں کی نسل کشی اور استحصال پر اپنی نوآبادیوں کی بنیاد رکھی۔یورپ اور امریکہ کے درمیان اپنی شناخت اور اپنی جڑوں کی تلاش میں کوشاں اِن مستقل نوآبادکاروں نے اسپین کی جاگیردارانہ روایت سے انقطاع کے بعد برطانیہ کے سرمایہ دارانہ اقدار کو اپنے معاشرے میں فروغ دینے کی آرزو کی۔کین (Cane) کا ناول "ایستھر" (Esther) بھی ارجنٹینا کے ساتھ اینگلوسیکسن تعلقات کی خواہش کو ظاہر کرتا ہے اِسی طرح قومی مفاہمت کی آرزو میں بارتولومے مترے (Bartolome Mitre) کا ناول سولی داد (Solidad) وجود میں آتا ہے۔ اِس دور کا اہم ناول امالیہ (Amalia) جوزے مرمول (Jose Marmal) کے قلم سے تخلیق ہوا۔اس میں روزاز کی حکومت کے خاتمے کی توجیہات کے ساتھ ساتھ مستقبل میں وفاق پسند اور مرکز پسند گروہوں کی مفاہمت کی تجویز ہے۔"اکثر حوالوں سے یہ ایک تاریخی ناول ہے جو بیونس آئرس میں آمرانہ عہد اور تاریخی کرداروں کی دولت بشمول روزاز بذاتِ خود اور اُس کی تعیش پسند خواہرِ نسبتی ماریا جوزفا کی زندگیوں کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔"(۱۵)

امالیہ اور اِس کی پیروی میں لکھے جانے والے ناولوں میں مقامی موضوعات، قدرتی مناظر، روایات، رسوم، انڈین اور گاچو کردار بنیادی طور پر رومانوی اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں۔

ناول نگاری کے اس اوّلین دور میں ارجنٹینا کی قومی تشکیل، انتہا پسند سیاسی گروہوں کے اختلافات، برطانوی سرمایہ دارانہ نظام اور جدید کاری جیسے موضوعات مصنفین کے پیشِ نظر رہے۔ قوم کا تصور جس طرح نوآبادیات میں آزادی کا جوش وجذبہ پیدا کرتا ہے، مختلف گروہوں کو وقتی اختلافات بالائے طاق رکھ کر ایک مقصد کے لیے جدوجہد پر مجبور کرتا ہے اُسی طرح نوآبادیاتی باشندوں کو قومی شناخت کی تلاش کے سفر پر روانہ کرتا ہے، اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کی تشکیلِ نو کی طرف راغب کرتا ہے۔ برِصغیر میں اس عمل کا آغاز نوآبادیاتی نظام کے قیام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا جب اصلاحی اور تاریخی ناولوں کے ذریعے اپنے وجود کی اصل کا بیانیہ مرتب کیا گیا جب کہ ارجنٹینا میں یہ صورتِ حال آزادی کے بعد پیش آئی جب وقتی فائدے کے لیے مخالف قوتیں اکٹھی ہوئیں جن کے اتحاد اور تاریخی جبر کے تحت اسپین کو وہاں سے جانا پڑا مگر آزادی کے بعد قوم کا تصور اشرافیہ کے انھی دو گروہوں کے مفادات کی نذر ہو گیا۔ تصورِ قوم کی تشکیلِ نو کے لیے تاریخی کرداروں اور واقعات کو بنیاد بنا کر جو ناول تخلیق ہوئے ان میں قوم کے اتحاد اور مستقبل کے لیے نئے راستوں کے تعین کی تمثیل پیش کی گئی۔

اُنیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ارجنٹینا کے ادب میں نئے موضوعات داخل ہوئے۔ جدید طرزِ زندگی نے لاطینی امریکی ممالک میں سے ارجنٹینا کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ معاشرتی اور معاشی زندگی کی نئی جہت ناول میں بھی منعکس ہونے لگی۔ لُوسیووی لوپیز (Lucio v Lopez) نے لاگرین آلدیا (La gran Aldia) میں بیونس آئرس میں تبدیلی کے دو دہائیوں پر مبنی دور کو بیان کرنے کے لیے حقیقت نگاری کا سہارا لیا اس میں لوپیز نے بیونس آئرس کے نیم جاگیردارانہ ماحول سے یورپی تہذیب میں رنگ جانے تک کے سفر کو بیان کیا ہے۔ جوزے ماریا میرو نے بازارِ حصص میں مندی کے پسِ منظر میں معاشی اور اخلاقی بحران کو ناول لابولسا (La Bolsa) میں بیان کیا ہے۔ ترکِ وطن اور تارکینِ وطن کے مسائل بھی اِس دور کے ناول کا موضوع رہے۔

ارجنٹینا کے ناول کے اسلوبیاتی اور تکنیکی رجحانات یورپی خصوصاً فرانسیسی ادب سے متاثر ہیں۔ زولا کی فطرت نگاری سے جن ادیبوں نے اثرات لیے ان میں ویا فائی ارگیرچ (Villa Faiie Argerich)، مینویل لی پودیستا (Manuel Le Podesta)، فرانسسکو اے سکردی (Francisco A Sicardi) اور مارتن گارسیا مے رو (Martin Garcia Merou) شامل ہیں۔ اس حوالے سے سب سے اہم ادیب اے اوہینو کامباسرس (Eugenio Cambaceres) ہے جس نے اپنے پہلے ناول پوٹ پوری (Pot Pourri)

میں ارجنٹینا کی سیاسی اشرافیہ پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کی بُرائیوں، موقع پرستی، جھوٹ اور غیر اخلاقی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔(۱۶)

ارجنٹینا کے اوّلین ناول نگاروں کی رومانویت ہو یا بعد میں آنے والوں کی حقیقت نگاری دونوں فرانسیسی ادبی رجحانات سے متاثر ہیں۔ میی ایسوسی ایشن کے سربراہ 'ایکویریا' نے پیرس میں چار سالہ قیام سے جو سیکھا وہی اس تنظیم کے منشور اور اس میں شامل ادیبوں کے نظریات میں جھلکتا ہے۔ ارجنٹینا ایک طرف سیاسی اور معاشی زندگی میں برطانیہ کی قربت حاصل کر رہا تھا تو دوسری طرف قومی فکر اور دانش کی آبیاری کے لیے فرانس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یوں ان دونوں اطراف میں مقامی انڈین باشندوں کے لیے کوئی جگہ موجود نہ تھی۔ ارجنٹینا کے ادب سے مقامی باشندوں کو اُسی طرح غائب کر دیا گیا جس طرح معاشرے سے۔ میی ایسوسی ایشن کے سیاسی منشور میں بھی اپنی نوآبادیوں کو انڈین سے پاک کرنا مقصد تھا اور اس کے ارکان کے ادبی منشور میں بھی مقامی لوگوں کے حوالے سے خاموشی اختیار کی گئی۔

آواں گارد کی اصطلاح بیسویں صدی کے اوائل کا وہ تخلیقی رجحان ہے جس نے گزشتہ صدی کے ادبی پیمانوں سے بیزاری کا اظہار کیا۔ یورپ میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۳۰ء تک جب کہ لاطینی امریکہ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک کا عرصہ اس میں شمار کیا جاتا ہے۔ آواں گارد رجحانات جن لاطینی امریکی ممالک میں زیادہ شدّت سے ظاہر ہوئے ارجنٹینا ان میں سے ایک ہے۔ ان رجحانات نے اسلوبیاتی سطح پر ادب کو مختلف جہتیں عطا کیں۔ یہ لاطینی امریکہ کے ناول کے برق رفتار عروج کا سبب بھی ہے۔ ان رجحانات کی بنیادی خصوصیت گزشتہ ادبی روایت کی شعوری مخالفت کرتے ہوئے جدّت اور تجربے کو مرکز نگاہ بنانا تھا۔ روایتوں کے اس رد اور توڑ پھوڑ کے اثرات اس دور کی شاعری پر زیادہ واضح ہیں جب کہ افسانوی ادب میں دورِ گزشتہ کی روایت کو زندہ رکھا گیا۔ ان تحریکوں کا دور ختم ہونے کے بعد ناول میں ان کے اثرات ظاہر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں نئے ناول کی ابتدا ہوئی اور ارجنٹینا میں یہ آغاز ایل ٹنل (El Tunnel) کی تخلیق سے ہوا۔

ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ دیگر نوآبادیاتی معاشروں کی طرح ارجنٹینا میں بھی اوّلاً ادبی فکر سیاسی نظریات کی آمیزش کے ساتھ ظاہر ہوئی، برِصغیر میں نوآبادکار کے بیانیے کی تائید اور فروغ اور اُس کے مقاصد کی تکمیل میں مقامی ناول نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر شامل رہے جب کہ ارجنٹینا میں مستقل نوآبادکاروں نے یہ ساری طاقت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ ارنستو ساباتو کا یہ جملہ "میں فن، مکالمے، آزادی اور ہر انسان کے احترام پر یقین رکھتا ہوں۔" (۱۷) زندگی کے حوالے سے ان کے نظریات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ساباتو نے ایک دانشور، صحافی، سائنس دان، سیاست دان اور ادیب کی حیثیت سے بیسویں صدی کے ارجنٹینا کی قومی اور ادبی زندگی میں اپنے نقوش چھوڑے۔ ارنستو ساباتو نے ۱۹۱۱ء میں اطالوی والدین کے ہاں بیونس آئرس میں جنم لیا۔

لا پلاٹا نیشنل یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں طبیعات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی بعد ازاں پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لیے پیرس چلے گئے وہاں سے ۱۹۴۰ء میں بیونس آئرس لوٹے۔گزرے دس سال سباتو کی شخصیت سازی اور اُن کی زندگی کے راستوں کے تعین میں انتہائی اہمیت کے حامل رہے۔انھوں نے سائنس کی تعلیم حاصل کی مگر دورانِ تعلیم ہی اُن کی دلچسپیوں کا مرکز انسان اور معاشرہ بنتا گیا۔یہ وہی دور تھا جب ارجنٹینا میں ''پیرون'' کے طویل آمرانہ دورِ حکومت کا آغاز ہو چکا تھا۔فرد کی آزادی اور اخلاقی اقدار پر یقین رکھنے والے سباتو خود کو اس صورتِ حال میں غیر جانبدار نہ رکھ سکے۔انھوں نے محض سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے تجربہ گاہوں میں بند ہونے کی بجائے انفرادی آزادی کی جدوجہد کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا۔لہٰذا اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔۱۹۴۴ء میں سباتو کو فاشزم کے خلاف منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے برسلز جانے کا موقع ملا جہاں سباتو کے نظریات میں کمیونزم کے حوالے سے بد لاؤ آنا شروع ہوا۔یہ وہ دور تھا جب روس نہ صرف مارکسی نظریات کی تجربہ گاہ تھا بلکہ اس تنظیم کو دُنیا بھر میں منظم کرنے اور بنیادی فیصلہ سازی کے عمل میں بھی اہم کردار کا حامل تھا۔بیسویں صدی کے نصف تک آتے آتے کئی لاطینی امریکی ممالک میں کمیونزم سے دلچسپی کا اظہار ہوا۔ہمارے ہاں بھی قیامِ پاکستان سے قبل سجاد ظہیر، رشیدہ جہاں، فیض احمد فیض، علی احمد وغیرہ نے مارکسزم کے فروغ کی کوشش کی مگر ۱۹۴۷ء کے بعد حکومتی سطح پر ان کی حوصلہ شکنی ہوئی تاہم لاطینی امریکی ریاستوں خاص طور پر کیوبا میں تو مارکسزم کو کامیابی حاصل ہوئی۔انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے آخر تک لاطینی امریکی ممالک میں حکومتوں کے عدم استحکام کا سبب کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کا ٹکراؤ تھا۔بہر حال کمیونسٹ پارٹی میں ماسکو کی آمرانہ حیثیت نے فرد کی آزادی پر ایمان رکھنے والے سباتو کو اس نظریے سے منحرف کر دیا۔پیرس میں پوسٹ ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں قیام کے دوران سباتو کی ملاقات سُرریلسٹ ادیب آندرے بریتوں اور آواں گارد کے دوسرے یورپی ادیبوں سے ہوئی جن کے اثرات سباتو کی تحریروں پر بھی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ارجنٹینا میں نئے ناول کی بنیاد میں سباتو کا کردار بہت کچھ دورۂ پیرس اور وہاں کی ادبی اور علمی فضا کے مشاہدے کا مرہونِ منت ہے۔ارنستو سباتو ۱۹۴۰ء میں لاپلاٹا یونیورسٹی میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔خارجی سطح پر موجود اور مقبول نظریات کی حقیقت کے کشف ارجنٹینا میں پیرون آمریت، عالمی سطح پر ایک جنگ کے نتائج بھگتتی ہوئی مظلوم انسانیت اب دوسری جنگِ عظیم کا ایندھن بننے کے لیے مجبور اور داخلی کشمکش نے سباتو کو جس وجودی بحران کا شکار کیا اُس میں انھوں نے سائنس کے مضمون کو چھوڑ کر ادبی فلسفیانہ مضامین لکھنے شروع کیے جو ممتاز ادبی رسالے ''سُر'' اور ایک مقبول قومی اخبار ''لانیشن'' کے ادبی ضمیمے میں شائع ہوئے۔(۱۸)

اِن مضامین میں بیرون مخالف خیالات کی بدولت سباتو کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔

سباتو کے مشہور ناولوں میں ''ایل ٹنل'' ۱۹۴۸ء ''سوبرے ہیروز ای تومباز'' ۱۹۶۱ء اور ''دی اینجل آف ڈارک نیس'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئے۔ سباتو نے عملی زندگی میں ادب کا انتخاب کیوں کیا اس حوالے سے وہ خود کہتے ہیں:

''اگرچہ میں نے طبیعات اور ریاضی میں تعلیم حاصل کی، ایسے مضامین جنھوں نے مجھے دُنیا کے انتشار سے بہت دور ایک ''افلاطونی بہشت'' میں ایک تجریدی اور مثالی قسم کی پناہ گاہ مہیا کی تاہم مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ اندھے یقین۔ جو کہ کچھ سائنس دان خالص سوچ میں، علت میں اور ترقی میں (عام طور پر احساسِ برتری کے ساتھ) رکھتے ہیں۔ نے اُن سے انسانی زندگی کے لازمی پہلو جیسے کہ لاشعور اور اساطیر جو فنی اظہار کی اصل میں موجود ہوتا ہے، مختصراً انسانی فطرت کی پوشیدہ جہت کو نہ صرف نظر انداز کروایا بلکہ اُس کو حقیر جانا۔'' (۱۹)

ارنستو سباتو کے سائنس اور انسان کے حوالے سے یہی نظریات اور خیالات اُن کے فکشن میں موضوعات کا تعین کرتے ہیں۔ محولہ بالا تینوں ناول انسان کے وجودی مسائل اور عصری حالات میں اخلاقی بحران بارے آواز اُٹھاتے ہیں۔ سباتو کا پہلا ناول ایل ٹنل جو اُردو میں ''سرنگ'' کے نام سے ترجمہ ہوا نہ صرف جدیدکاری کے جنون میں مبتلا بیونس آئرس کے فرد کی وجودی تنہائی اور نفسیاتی مسائل کو اجاگر کرتا ہے بلکہ لاطینی امریکہ کو ادبی دُنیا میں امتیاز دلانے والی ادبی تکنیک جادوئی حقیقت نگاری کے اوّلین نقوش بھی اس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سُرنگ، ''یہ محبت، حسد اور قتل کا ناول ہے۔ لیکن اس کا موضوعاتی اختصاص مرکزی کردار کی بیگانگی ہے۔'' (۲۰)

ارنستو سباتو کا یہ ناول ان وجودی مسائل کو اجاگر کرتا ہے جو بیسویں صدی کے انسان کا مقدر بن چکے ہیں، بے بسی، تنہائی، مایوسی اور خوف کی وہ سرنگ جس کے اندر قید انسان اپنے مستقبل سے بے خبر ہر لمحہ انہونی کے خدشات کے ہمراہ جی رہا ہے۔ ارجنٹینا کے اس ناول نگار کے حصے میں تاریخ کا جو عرصہ آیا وہ پُرانی اقدار کے مدفن پر قائم ہوا تھا۔ عالمی جنگوں نے انسان کا انسان پر سے اعتبار ختم کر دیا تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے منفی اثرات نے انسانی وجود کو بے وقعت کر دیا تھا، کامیو اور سارتر جیسے وجودیت پسند فلسفی اپنی تحریروں میں نئے نئے تصورات زیرِ بحث لا رہے تھے نظریات کی موت واقع ہو رہی تھی، بینکاری کی جدت اور سرمایہ دارانہ نظام نے قوموں کی زندگی کو ہر پل بے یقینی کے سپرد کر رکھا تھا، عالمی سطح پر موجود یہ وہ منظرنامہ تھا جس میں سرنگ تخلیق ہوا۔

یہ ناول ہجوم میں گھرے انسان کی تنہائی کو موضوع بناتا ہے۔بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جدید زندگی کے ہاتھوں انسان کی بےقدری اور بے وقعتی کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اُس خالی پن پر بھی توجہ دیتا ہے جو سرنگ کی طرح تاریک اور سرد ہے۔ناول کے مرکزی کردار حوان پابلو کاستیل کی بے اعتباری اور بے یقینی اس تاریخی صورتِ حال کی تمثیل ہے جو بیسویں صدی کے نصف اوّل میں پیدا ہوئی۔حوان پابلو کاستیل کی اعصاب زدگی اور پاگل پن جس طرح جدید زندگی کے مسائل کا شاخسانہ ہے اسی طرح زندگی کی جدید کاری کے جنون میں مبتلا انسانی دانش کی بھی علامت ہے۔

ناول کی کہانی اس کا مرکزی کردار حوان پابلو کاستیل پاگل خانے میں انٹرویو دیتے ہوئے سناتا ہے۔کاستیل ایک مصوّر ہے اور اپنی تصویروں کی نمائش میں اُسے ایک ایسی عورت دکھائی دیتی ہے جو اس کی سب سے پسندیدہ تصویر میں موجود اُس منظر پر توجہ مرکوز کیے کھڑی ہے جسے کسی اور نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ کاستیل کو احساس ہوا کہ یہ واحد وہ ہستی ہے جو اس کی طرح سوچتی ہے اور جو اس کی تنہائی اور اداسی کو سمجھ سکتی ہے۔لہٰذا وہ اس کی تلاش میں مہینوں بیونس آئرس کی گلیوں کی خاک چھانتا ہے۔کئی منصوبے بناتا اور کئی تجاویز رد کرتا ہے۔ہر چیز سے بیگانہ محض ماریا ری بارنے سے ملاقات اور تعارف کے مراحل پر سوچ بچار کرتا ہے۔ بالآخر ماریا اُسے سرِ راہ مل جاتی ہے دونوں میں شناسائی قائم ہوتی ہے اور محبت تک بات جا پہنچتی ہے۔مگر ماریا کی پُراسرار شخصیت اور کاستیل کے نفسیاتی عارضے نے بے اعتباری اور بے یقینی کی دیواریں ان دونوں کے درمیان اُٹھانا شروع کیں۔کاستیل ماریا کے عشق میں مبتلا کبھی تو اس پر شک کرتا اور اذیت پہنچاتا اور پھر دوسرے ہی لمحے ہمدردی جتاتا۔بہرحال کاستیل کی دوہری شخصیت میں جیت اذیت رساں شخصیت کی ہوتی ہے اور وہ ماریا کو قتل کر ڈالتا ہے۔

ناول کی پوری فضا پر لغویت سے ابھرنے والے مسائل نے ناول کے مرکزی کردار حوان پابلو کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔لغو صورت حال اور بے معنویت ہے کیا؟ اور کیوں پیدا ہوئی؟ کیا بیسویں صدی سے قبل دُنیا اور کائنات بامعنی تھی۔انسان اپنے وجود کے حوالے سے کسی قسم کے مسئلے سے دوچار نہ تھا۔"یہ دُنیا بذاتِ خود قابلِ توجیح نہیں ہے۔یہی کہا جا سکتا ہے۔لیکن لغو جو ہے وہ غیر معقولیت اور انسان کے دل میں گونجنے والی معنی کی وحشی خواہش کے درمیان تصادم ہے۔لغو کا انحصار جتنا انسان پر ہے اُتنا ہی دُنیا پر ہے۔اصل میں یہی ہے جو دونوں کو جوڑتا ہے۔یہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے باندھتا ہے جیسے نفرت دو مخلوقات کو اکٹھا رکھتی ہے۔"(۲۱)

گویا جب کائنات کی پُراسراریت سے انسان کے اندر موجود معنی کی آرزو ٹکراتی ہے تو لغویت کا جنم ہوتا ہے۔سارتر کامیو کی تصنیف اجنبی کے دیباچے میں رقم طراز ہے:

''لغویت یقینی طور پر نہ ہی انسان کے اندر ہے اور نہ کائنات کے اندر، جب آپ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں، لیکن اس دُنیا میں موجود ہونے کی حیثیت سے انسان کی نمایاں خصوصیت آخر کار لغویت ہے جو انسانی حالت کا لازم ملزوم حصہ ہے۔'' (۲۲)

ژاں پال سارتر کے نزدیک انسان آزاد ہے اور اس ناقابل فہم دُنیا میں اپنے معنی تلاش کرنے پر مجبور ہے۔ ذات بذات خود اور ذات رائے خود کے تصورات اس وقت لایعنیت کو جنم دیتے ہیں جب ایک طرف سارتر کسی بھی مقتدرہ کی موجودگی سے انکار کرتے ہوئے انسان کی اس دُنیا میں موجودگی کو حادثاتی قرار دیتا ہے۔ جہاں انسان پہلے سے کوئی منصوبہ، کوئی تقدیر کوئی معنی یا زندگی کی کوئی جہت لے کر نہیں آتا۔ بلکہ وہ اپنی زندگی کے راستوں کا تعین کرنے کے لیے آزاد ہے۔ گویا مقتدر قوت سارتر خدا سے لے کر انسان کے حوالے کرتا ہے۔ ایک طرف وہ خدا کی عدم موجودگی کا اعلان کرتا ہے اور دوسری طرف انسان کو خدا کے درجے پر فائز کرتے ہوئے لایعنی صورتِ حال کو جنم دیتا ہے پھر اگر انسان آزاد ہے تو یہاں بھی آزادی اس وقت ایک لایعنی کیفیت میں بدل جاتی ہے جب انسان کو انتخاب کے جبر سے گزرنا پڑتا ہے کہ اس جبر سے گزرے بغیر آزادی نامکمل رہتی ہے۔

کیرکے گارڈ کی فکر میں تصادم اور ٹکراؤ کا شکار ہونے والی دو قوتیں یقین اور اخلاق ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ خدا کے حکم پر بیٹے کو قربان کرنے لگے تو ایک باپ کے اخلاق اور خدا پر یقین رکھنے والے انسان کے عقیدے کے درمیان تصادم نے لایعنیت کو جنم دیا۔ دورِ جدید میں بھی یہی ہوا کہ ایک طرف زندگی کی بے حسی، بے نیازی اور پُراسراریت ہے جبکہ دوسری طرف انسان کی اُمید، دونوں کی ایک ہی زمان و مکان میں موجودگی سے لغویت پیدا ہوتی ہے۔ ارنسٹو ساباتو کے اس ناول کا مرکزی کردار اسی طرح دو مخالف خیالات کے ٹکراؤ میں گھرا لغو صورتِ حال کو جنم دے رہا ہے کہ ایک طرف وہ بغیر شرمندگی اور پچھتاوے کے اعتراف کرتا ہے:

''.....اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں حوان پابلو کاستیل ہوں، وہی مصور کہ جس نے ماریا اری بارنے کو مار ڈالا تھا.....'' (۲۳)

کاستیل اپنے اس اقدام کو حق بجانب ثابت کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

''.....مجھے صاف صاف اعتراف ہے کہ اب میں پچھتایا کرتا ہوں کہ جس وقت میں آزاد بندہ تھا تو اپنے وقت کو بہتر مصرف میں نہ لا سکا۔ یعنی کہ چھ سات افراد کو پتا نہیں کاٹ دیا جن کے میں نام دہرا سکتا ہوں۔'' (۲۴)

دوسری طرف جب وہ اعتراف کرتا ہے:

''ایک شخصیت ایسی تھی جو سمجھ سکتی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور وہی تھی جسے میں نے مار دیا۔'' (۲۵)

کاستیل کی سوچ کا یہ تضاد لغو ہے۔ یہ اُسی لغویت کی باطنی صورت ہے جس کا مشاہدہ وہ اپنے خارج میں اپنے اردگرد کی زندگی میں کرتا ہے۔ کہانی کا عمل ایک بڑے اور ترقی یافتہ شہر بیونس آئرس میں وقوع پذیر ہوتا ہے جہاں کے پُرہجوم بازار اور بڑی بڑی عمارتیں، کلب اور پارک انسان کی بے وقعتی اور تنہائی کو بڑھانے کے لیے موجود ہیں۔

انسان کے وجود تقدیم اور اس کو درپیش خطرات اور مسائل کا احساس سب سے پہلے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے تحت آغاز پانے والی سائنسی اور علمی ترقی کے جلو میں اُجاگر ہوا۔ سائنسی اور علمی ترقی نے ایک طرف یورپی انسان کے لیے زمین کی حدود کو وسعت عطا کی۔ کئی ملکوں اور کئی قوموں کو اس کے تصرف میں دے دیا۔ ٹیکنالوجی کے بل پر زندگی سہل ہوگئی۔ دوسری طرف فوق البشر کا علم بلند کرنے والے نطشے اور ہٹلر نے تمام قدیم اخلاقی اقدار اور انسانی معیارات کو مسترد کرتے ہوئے اپنے صحیفے جاری کیے۔ یوں یورپی انسان کو فلک بوس عروج عطا کرنے والی سائنس نے ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے المیوں کو جنم دیا۔ اپنی قاصر فہم دُنیا کو انسان سائنسی مفروضوں کی نذر ہوتے ہوئے کس طرح دیکھتا ہے۔ کامیو اس حوالے سے کہتے ہیں:

> ''اور یہاں درخت ہیں اور میں جانتا ہوں ان کی کھردری سطح، پانی اور میں اس کا ذائقہ محسوس کرتا ہوں گھاس کی خوشبو اور رات کے ستارے، کچھ شاخیں جب دل کو قرار ہوتا ہے۔ میں کس طرح اس کائنات کا انکار کرسکتا ہوں جس کی طاقت اور استحکام کو میں محسوس کرتا ہوں؟ مگر زمین پر یہ سارا علم مجھے یہ یقین دلانے کے لیے کچھ نہیں دے گا کہ یہ دُنیا میری ہے۔ تم اسے مجھ سے بیان کرتے ہو۔ اور تم مجھے اس کی درجہ بندی سکھاتے ہو۔ تم اس کے قوانین بناتے ہو۔ اور میں اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لیے تسلیم کرلیتا ہوں کہ وہ سارے سچ ہیں۔ تم اس کی میکانکیت کو منکشف کرتے ہو اور میری اُمید بڑھ جاتی ہے۔ آخری مرحلے میں تم مجھے سکھاتے ہو کہ یہ حیران کن اور متنوع کائنات کی بنیاد ایٹم پر ہے اور یہ کہ ایٹم بذاتِ خود الیکٹران سے بنا ہے..... یوں سائنس جو مجھے سب کچھ سکھاتی ہے ایک مفروضے پر ختم ہوجاتی ہے اور فصاحت کو جنم دینے والا استعارے میں اور غیر یقینیت آرٹ میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ تو مجھے اتنی ساری کاوشوں کی کیا ضرورت تھی؟''(۲۶)

آخر کار اس صورت حال میں کامیو فیصلہ سناتا ہے:

> ''اس ناقابل فہم اور محدود کائنات میں انسان کی قسمت آج کے بعد اپنے معنی تلاش کرنا ہے۔''(۲۷)

بیونس آئرس اور اس کا طرز زندگی یورپی فکر کا نمونہ ہے۔ ارنستو سباتو نے یہاں کے انسان کا وجودی المیہ اجاگر کرتے ہوئے اسی طرز زندگی کو پیش نظر رکھا ہے۔ سباتو کے ساتھ تو معاملہ یہ بھی ہے کہ وہ صرف ارجنٹینا

یا لاطینی امریکہ تک محدود نہیں بلکہ وہ عالمی دُنیا اور عالمی حالات پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ ملکی اور عالمی سیاست سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ حالات کو صحیح رُخ پر ڈالنے کے لیے قلم کا استعمال بھی کیا۔ اسی کی پاداش میں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہرحال سباتو کے قیام پیرس کے زمانے میں ہی کامیو اور سارتر وجودیت کی اقلیم میں نئے نئے تصورات متعارف کروا رہے تھے۔ علمی دُنیا زندگی کی لغویت کے حوالے سے مباحث کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ مصنف کی اپنی افتادِ طبع اور سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی حالات اس کی فکری جہت کا تعین کرنے میں مددگار رہے۔ جن حالات نے کامیو سے اجنبی لکھوایا انھی حالات نے سباتو سے سرنگ تخلیق کروایا۔ ناول کے یہ جملے ذرا دیکھیے:

''بعض مرتبہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ہزاروں برس سے فنا کے راستے پر گامزن ایک سیارے پر ہم دکھ کے درمیان جنم لیتے ہیں۔ بڑھتے ہیں۔ ہم جدوجہد کرتے ہیں ہم بیمار پڑتے ہیں۔ ہم دکھ بھگتتے ہیں۔ ہم اوروں کو دکھ دیتے ہیں۔ ہم پکار اٹھتے ہیں ہم مرجاتے ہیں اور دوسرے لوگ مرجاتے ہیں۔ اور دوسرے وجود جنم لیتے ہیں کہ اس کے معنی کو از سرِ نو شروع کردیں۔''(۲۸)

ناول کا مرکزی کردار کاستیل زندگی کی بے معنی تکرار کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس پر جس لغویت کا حکم لگاتا ہے اسی لغویت کو البرٹ کامیو نے سسی فس کی اسطورہ کے ذریعے بیان کیا ہے۔ دیوتاؤں کے غضب کا شکار سسی فس بے نتیجہ محنت اور مایوس کن کاوش کی سزا پاتا ہے۔ مگر وہ اس سزا کو قبول کر کے اپنا اختیار بھی استعمال کرتا ہے۔

''وہ اس نازک لمحے جب انسان اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ جب سسی فس اپنی چٹان کی طرف واپس لوٹتا ہے۔ اس نگاہ واپس میں وہ اپنے بے ربط سلسلہ اعمال کے متعلق سوچتا ہے جو اس کی قسمت بن جاتا ہے۔ جس کا وہ خالق ہے۔''(۲۹)

سسی فس کو دیوتاؤں کے راز سے پردہ اُٹھانے کی سزا ملی تھی تو کیا آج کا انسان بھی سسی فس کے مثل ہی نہیں جس نے سائنس اور علم کی صورت کائنات کے راز منکشف کیے۔ اور پھر اسے بے معنی محنت، لغو زندگی اور لغو موت کی سزا سنادی گئی۔ سرنگ کے بھی سبھی کردار کاستیل، ماریا اور ماریا کا شوہر آئندے اپنے ہی ہاتھوں لکھے اعمال نامے میں قید اپنے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کاستیل کو تو بخوبی احساس ہے کہ اس کی زندگی میں عورت کا ساتھ نہ ہونا اس کی سزا ہے۔

ماریا اری بار نے جب کاستیل سے ملے بغیر زمینوں پر چلی جاتی ہے اور کاستیل اسے ہنٹر سے ملاقات کا بہانہ سمجھتے ہوئے غضب ناک ہو کر خط لکھتا ہے۔ خط ڈاک کے سپرد کر کے لوٹتا ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ شاید اس نے خط میں زیادہ ناراضی کا اظہار کر دیا ہے۔ پھر وہ اس خط کو واپس حاصل کرنے کی بڑی تگ و دو کرتا ہے تاکہ وہ متن کو بدل سکے مگر ناکام رہتا ہے۔ گویا ایک بار جو عمل سرزد ہو گیا اس کی اصلاح کی گنجائش نہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے انسان کا اس دُنیا میں موجود ہونا حادثاتی تھا خط کا یہ متن بھی کچھ جذباتی اور حادثاتی حالات و واقعات کا نتیجہ تھا۔اب اس عمل کے نتائج بھگتنے کے لیے کاستیل مجبور تھا۔انسان اگر عدم میں ایک غلطی کے نتیجے میں اس بے معنی زندگی کا حق دار ٹھہرتا ہے تو کاستیل بھی اپنے جذباتی لمحات کی غلطی کی پاداش میں ماریا اری بار نے جو اسے سب سے زیادہ سمجھتی ہے کا قاتل قرار پاتا ہے۔اگر چہ خط کے بعد کے واقعات خط کے متن سے بھی زیادہ شدید تھے مگر آغاز اس خط کی تحریر سے ہی ہوا۔

''کیا کاستیل کو واقعی ماریا سے محبت تھی؟اس کا جواب کاستیل خود دیتا ہے۔''سوال تو یہی ہے مجھے اس کی ضرورت کس لیے تھی؟اس لمحے سے پیشتر میں نے یہ سوال اپنے آپ سے بھی نہیں پوچھا تھا۔محض ایک جبلت کی تعمیل کیے جا رہا تھا۔''(۳۰)

کیا ہے کاستیل کی جبلت؟ ماریا کی جسمانی قربت،جنسی کشش،معاشرتی ضرورت یا پھر روحانی تسکین؟ جہاں تک جنسی ضرورت کا تعلق ہے تو کاستیل کو اس کے لیے مہینوں ماریا کے پیچھے خوار ہونے کی ضرورت نہ تھی نہ ہی تنہائی دور کرنے کے لیے اس قدر پاگل پن درکار تھا۔تو کیا وہ اس خالی پن کو بھرنا چاہتا تھا جو کاستیل نے اپنی تصویر میں دکھایا تھا اور جسے صرف ماریا نے سمجھا تھا۔کیا وہ ماریا کے بجائے اس ترقی یافتہ شہر کی لغویت میں زندگی کے معنی تلاش کر رہا تھا۔مگر مہینوں پر مبنی لایعنی تلاش کا عمل جو خود بھی لغو اور بے معنی دکھائی دیتا ہے کسی سوال کا جواب اور کسی خواب کی تعبیر کیسے ہو سکتا ہے۔ماریا اگر اس کے کسی سوال کا جواب ہوتی یا اس کی تنہائی اور اداسی کا مداوا ہوتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔یا فرض کریں ماریا لغو زندگی میں مقصد کا استعارہ ہے اور انسان کی اُمید اور خواہش ہے تو پھر پیچیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ان دونوں کی بیک وقت موجودگی اور تصادم بھی تو لغویت کو جنم دیتا ہے۔کاستیل کہتا ہے:

''مجھے یقین تھا کہ بعض لمحوں میں ہمارے درمیان رابطہ بھی قائم ہوتا تھا۔مگر یہ رابطہ اتنا سبک اتنا عارضی ہوتا تھا کہ اس کے بعد میں پہلے سے بھی زیادہ بے چارگی کا مارا اور تنہا ہو جاتا تھا۔''(۳۱)

پھر یہ جبلت جس کا ذکر کاستیل نے کیا کہیں لغو اور بے مقصد زندگی کو جیے جانا تو نہیں۔انسانی تاریخ کے شواہد تو یہی بتاتے ہیں کہ انسان اگر اخروی زندگی،تصورِ خدا سے محروم ہو جائے ازلی اور ابدی زندگی کے مقاصد کو تیاگ ڈالے،جوہر کا انکار کر دے،تابع فرمانی سے منہ پھیر لے تو پھر یہ جبلت سسی فس کی طرح بھاری پتھر لڑھکائے جانے کی مشقت ہے۔کاستیل بھی ماریا سے ہر ملاقات کے بعد اُس کی ناقابل فہم بے اطمینانی کا شکار رہتا ہے جو محبت کے سپنے کو دوبارہ ڈھالنے سے پیدا ہوتی ہے۔کاستیل کی تنہائی مابعد الطبیعاتی تنہائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔کیونکہ:

''لیکن دوسری طرف اُمید اور روشنی سے اچانک محروم ہوجانے والی کائنات میں انسان خود کو ایک اجنبی اور غیر محسوس کرتا ہے۔اس کی جلاوطنی کا کوئی علاج نہیں۔کیونکہ وہ اپنے گم شدہ گھر کی یاد یا ارضِ موعودہ کی اُمید سے محروم ہوگیا ہے۔انسان اور اس کی زندگی،اداکار اور اس کے ماحول کے درمیان یہ علیحدگی دراصل لغویت کا احساس ہے۔''(۳۲)

کاستیل بھی اسی مابعدالطبیعاتی تنہائی اور مغائرت کا شکار ہے۔اسی لیے وہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں بعض کام کیوں کرتا ہوں۔یعنی ایسے کام جن کا تعلق شاید فراموش کردہ جنت سے ہے یا ان کے معنی ارضِ موعودہ میں ہوں جس کے ملنے کی کوئی اُمید نہیں خاص طور پر بیسویں صدی کے وجودی بحران میں:

''ذرا جہاز کے اس کپتان کے بارے میں سوچو جو مستقلاً اپنی نقل وحرکت کا نقشہ مرتب کر رہا ہے۔تمام تر وقت نظر کے ساتھ ایک منزل کی جانب سفر کر رہا ہے۔اور یہ بھی سوچو کہ اسے نہیں معلوم کہ وہ اس کی طرف رُخ کیوں کر رہا ہے۔''(۳۳)

کاستیل کے یہ جملے اس کائنات میں انسان کی کم مائیگی اور بے بسی کی علامت ہیں۔اس کی بے چارگی ماریا کے ساتھ اس مکالمے میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔

''میں محسوس کرتا ہوں کہ تم کسی ایسے کام کے لیے ضروری ہو جو میں کرنا چاہتا ہوں حالانکہ خود مجھے نہیں معلوم کیوں۔''(۳۴)

آخر وہ کون سا کام تھا جس کے لیے ماریا کی ضرورت تھی اور جس سے کاستیل لاعلم تھا۔ماریا کیوں ضروری تھی یہ وہ نہیں جانتا تھا۔کیا وہ کام ماریا کا قتل تھا جس کی طرف کاستیل ایک کے بعد ایک اضطراری واقعات سے گزرتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔کیا یہ راستہ اور طرزِ عمل کاستیل کا اپنا انتخاب تھا۔اگر بقول سارتر انسان آزاد ہے اور وہ انتخاب کا نہ صرف حق رکھتا ہے بلکہ وہ ہر صورت کسی نہ کسی عمل یا راستے کا انتخاب کرنے کا پابند ہے۔اگر وہ کسی بھی راستے کا انتخاب نہیں کرتا تو یہ بھی اس کا اپنا منتخب کردہ طرزِ عمل ہے۔ایسے میں کاستیل انتخاب کا بوجھ کندھوں پر اُٹھاتے ہوئے اس لغو دُنیا میں اپنا اعمال نامہ لکھتا ہے۔آخر میں ماریا کے قتل کی صورت میں وہ آزادی کی قیمت ادا کرتا ہے۔کامیو کے نزدیک قتل لغویت کے خلاف انسان کی بغاوت ہے۔اقدار سے خالی دُنیا میں اپنی قدریں متعارف کروانے کی کوشش ہے۔

''لغویت کو زندگی کے ایک اصول کے طور پر شمار کیا جاتا ہے تو اسی لیے متضاد ہے۔اس حقیقت کے بارے میں حیران کن یہ ہے کہ یہ ہمیں وہ اقدار مہیا نہیں کرتی جو ہمیں یہ فیصلہ کرنے کے قابل بنائے کہ قتل جائز ہے یا نہیں۔''(۳۵)

اقدار کے تعین کے حوالے سے کامیو مزید وضاحت کرتا ہے:

''اگر دُنیا اس انسان کی طرف سے بے حسی کا معاملہ ہے جو خودکشی کرتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے پاس کسی ایسی چیز کا تصور ہے جو نہ ہی اس سے لاتعلق رہ سکتا ہے اور نہ لاتعلق ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ہر چیز کو تباہ کر رہا ہے یا ہر چیز کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ لیکن اس کے اس خودکشی کے عمل سے جو قدر پیدا ہوتی ہے، وہ شاید اسے زندہ رہنے کے قابل بنا دے۔ مکمل انکار اسی لیے خودکشی سے تکمیل نہیں پاتا۔ یہ صرف اپنی اور دوسروں کی مکمل تباہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہاں خودکشی اور قتل ایک نظام کے دو پہلو ہیں۔ ایک تاریک جیت جس میں جنت اور زمین دونوں تباہ ہو جاتی ہیں۔''(۳۶)

کاستیل نے ماریا اری بارنے کے قتل سے لغویت کے خلاف ایک بغاوت کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کہیں اس کے اس عمل کے زیرِ سطح معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری بھی دخیل نظر آتی ہے۔ اس ذمہ داری کا بوجھ کاستیل نے خود اُٹھایا ہے اسی لیے وہ ناول کے آغاز میں معاشرے میں زہر پھیلانے والے کچھ اور لوگوں کے قتل نہ کر سکنے پر پچھتاوے کا اظہار کرتا ہے۔ مگر نہیں معاملہ یہاں ایک اور جہت اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کامیو اپنی تصنیف ''باغی'' کے تعارف میں کہتا ہے:

''پہلا اور واحد ثبوت جو لغو کی اصطلاح کے اندر مجھ تک پہنچتا ہے، وہ باغی ہے۔ تمام علم سے محروم قتل کے لیے مشتعل یا قتل کرنے کے لیے رضامند، میرے تصرف میں اس وقت یہ واحد ثبوت ہے جس کی دوبارہ تصدیق اسی غم/تکلیف سے ممکن ہے جو میں برداشت کرتا ہوں۔ باغی کا جنم بے معنویت کے اظہار کے طور پر ہوتا ہے جو بے انصافی اور ناقابلِ فہم حالات کا سامنا کرتا ہے۔ لیکن اس کی اندھی خواہش انتشار کے درمیان میں ترتیب اور عارضی پن کے درمیان اتحاد کا حصول ہے۔ یہ احتجاج کرتا ہے، مطالبہ کرتا ہے، یہ اصرار کرتا ہے کہ ظلم کا خاتمہ ہونا چاہیے اور وہ جواب تک کھسکتی ہوئی ریت پر تعمیر کیا جاتا رہا ہے آج کے بعد اس کی بنیاد چٹان ہونی چاہیے۔ اس کا مقصد تبدیل کرنا ہے لیکن تبدیلی/منتقلی عمل کو راہ دیتی ہے اور عمل ''کل'' ہے جو کہ ''مانا'' ہے۔ اور یہ ابھی تک نہیں جانتا کہ کیا یہ قتل جائز ہے۔''(۳۷)

ماریا اری بارنے کا قتل بھی لغویت کا نتیجہ ہے۔ کاستیل ماریا پر جو الزامات عائد کرتا ہے یا جن وجوہات کو وہ ماریا کے قتل کا جواز بناتا ہے، دراصل ان کے حوالے سے وہ خود بھی پر یقین نہیں یہ محض اس کا وہم یا شکوک وشبہات ہیں۔ وہ ماریا کی حرکات وسکنات اور اس کی گفتگو کو اپنی مرضی کے معنی پہناتا ہے۔ دراصل جس غیر یقینی کی کیفیات میں اسے زندگی ملی ہے وہی غیر یقینیت اور بے اعتباری اسے کسی پر بھی اعتبار کرنے کے

قابل نہیں چھوڑتی ۔لہٰذا وہ ماریا کے لیے اعتبار اور یقین پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے ۔ساحل سمندر پر ماریا کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے ماریا کے ان جملوں میں:

''میں نے کچھ اُکھڑے اُکھڑے جملے سنے ۔''میرے خدا اس ابد میں ہم کتنا کچھ ساتھ جی رہے ہیں .....بھیانک .....کاش کہ ہم بس یہ حسین منظر ہوتے ۔مگر نہیں ہم تو گوشت پوست ہیں ۔سفلہ اور بے وقعت ۔''(۳۸)

کاستیل کا ذہن صرف سفلہ اور بے وقعت پر اٹکتا ہے ۔جس سے وہ ماریا کی بد کرداری کے معنی اخذ کرتا ہے ۔بعد میں وہ بار بار اپنی اس رائے سے دست بردار بھی ہوتا ہے ۔مگر سب لاحاصل اور بے سود رہتا ہے ۔نتیجہ ماریا کے قتل کی صورت میں برآمد ہوتا ہے،جس پر اُسے خود بھی یقین نہیں کہ وہ اس قتل کے حوالے سے حق بجانب ہے یا نہیں ۔

انسان کے وجود کو بحرانوں کے حوالے کرنے میں جتنا کردار سائنس اور ٹیکنالوجی نے ادا کیا اتنا ہی مختلف نظریات نے ادا کیا ہے ۔بیسویں صدی کے نصف اوّل میں دونوں عالمی جنگوں کی پشت پر قومیت کے جذبات کارفرما تھے ۔ان عالمی جنگوں نے انسان کے یقین کو بُری طرح متزلزل کیا ۔مابعد الطبیعاتی جبر سے نجات حاصل کرنے کے لیے انسان نے جس سائنس میں پناہ لی تھی وہی سائنس اپنے ثمرات کے ساتھ جنگ میں انسان کو بے یار و مددگار چھوڑ چکی تھی ۔بے حسی اور ظلم کی اس داستان کی طرف سباتو،سرنگ کے مرکزی کردار،کاستیل کی زبان سے اشارہ کرتے ہیں:

''خودکشی کی تمام تر ترغیب اس کے پُر سہولت عدم میں ہوتی ہے ۔ایک لمحے میں یہ تمام مہمل دُنیا ایسے بیٹھ جائے گی جیسے کوئی دیوزاد چربہ ہو،گویا اس کی آسمان شگاف عمارتوں جنگی جہازوں،ٹینکوں،زنداں خانوں کا ٹھوس پن،سراب کے سوا کچھ بھی نہ تھا ۔بدخواب کے جنگی جہازوں عمارتوں،ٹینکوں،زنداں خانوں کی طرح محض دھوکا ۔''(۳۹)

نظریات اور مفادات نے اس دوران زندگی کا یہی رُخ دکھایا جس کے نظارے سے انسان کائنات کی بے معنویت پر یقین کرتے ہوئے اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کی موت پر خود بھی خودکشی کی طرف راغب ہوتا ہے،مگر افسوس خودکشی کو قبول کرتے ہوئے انسان معاشرے کو جہنم بنانے والے حالات کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے ۔وجودی فلسفیوں کے نزدیک خودکشی کرنے والا سمجھتا ہے کہ وہ اپنی قربانی دے کر تمام حالات کو ٹھیک کرے گا کہ اس کے ساتھ ہی انتشار اور بدنظمی ختم ہو جائے گا جبکہ ایسا نہیں ہے ۔

ارنستو سباتو کے ملک کی تاریخ خود قومی تشکیل کے مراحل میں بدترین آمریتوں،انتشار،اور بدنظمی سے پُر تھی ۔اسی طرح معاشی مساوات کا علم بلند کرنے والا معاشی نظام مارکسزم اگرچہ انسانوں کو بورژوا

آمریت اور استحصال سے نجات دلانے کی بات کرتا تھا، مگر مارکسزم کی اجتماعیت، فرد کی انفرادیت کی قائل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کامیو اور سارتر اس تحریک کی انسان دوستی سے متاثر ہو کر اس سے وابستہ ہوئے مگر پھر اس کے اندر آمرانہ عناصر کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس سے الگ ہو گئے اور انسان کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے الگ راہیں تلاش کیں۔ سباتو نے بھی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی مگر اپنے آدرشوں کی نامرادی کو دیکھتے ہوئے اسے خیر باد کہہ دیا۔ سباتو نظریوں میں چھپے ہوئے تضادات سے جلد ہی آشنا ہو گیا اور نظریے کی حاکمیت کے خلاف ..... جو فرد کو کل میں گم کر دیتا ہے ..... فرد کی آزادی کی طرف بڑھتا گیا۔ یہاں ناول کا مرکزی کردار کاستیل، ارنستو سباتو کا پروٹو ٹائپ محسوس ہوتا ہے:

> ''میں نفرت کرتا ہوں تمام فرقوں، برداریوں، ہر قسم کے گروہوں اور احمقوں کی ان تمام جتھا بندیوں سے جن کا سبب پیشہ، ذوق، یا ملتے جلتے جنون ہیں۔ ان تمام گٹھ بندیوں میں بعض خواص مشترک ہوتے ہیں۔ اقسام کی تکرار، اصطلاحی زبان اور ان کا متکبرانہ یقین کہ وہ باقی سب سے افضل ہیں۔''(۴۰)

اصطلاحات زدہ زبان کے حوالے سے بھی ایک طرح کی اجارہ داری کا تصور ابھرتا ہے جو محض مخصوص اصطلاحات جاننے والے گروہ کی ملکیت ہوتی ہے۔ ''پھر وہی ان کی اصطلاحی زبان، ان کی ایک اور خصوصیت جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کی جو مرضی آئے مثال چن لیجیے۔ تحلیل نفسی، کمیونزم، فاشزم، جرنلزم، ان میں سے کوئی ازم میرا پسندیدہ نہیں۔ میرے لیے سب قابل نفرت ہیں۔''(۴۱)

اس نفرت کا جواز ہے کیونکہ یہ سب ازم وجود انسان کی انفرادیت سے انکار کرتے ہیں۔ کوئی بھی نظریہ اس سے متعلق یا غیر متعلق انسانوں کے گروہ میں وہی کردار ادا کرتا ہے جو کائنات میں مقتدر قوت ادا کرتی ہے۔ آج سے قبل جس کے پاس انسان نے تقدیر لکھنے کا اختیار دے رکھا تھا، جہاں سے انسان جینے کے معیار اخذ کرتا تھا جو علت و معلول کے تعلق کے بغیر انسان کو مشکل میں ڈالتی تھی۔ اس سے جان مال اور عزت کا خراج وصول کرتی تھی۔ انسان اپنے ہر عمل کے لیے اسی کی طرف نظر اُٹھائے دیکھتا تھا۔ اسی طرح نظریہ بھی بنے بنائے معیارات، قدریں اور مقاصد فراہم کرتا ہے اور ان کے تحفظ کے لیے انسان سے خراج مانگتا ہے۔ انسان کی آزادی کو سلب کرنے والے ایسے نظریات سے انسان نفرت کرتا ہے اور کیا بے جا ہے یہ نفرت؟ گزشتہ صدی میں زندگی کا آشوب انھی نظریات کی کوکھ سے تو پھوٹا تھا۔

ناول میں ماریا کے قتل کا معمہ آخر تک حل نہیں ہوتا۔ کاستیل کا ماریا کے شوہر آسندے کو ماریا کی بے وفائی کے حوالے سے آگاہ کرنا، آسندے کا احمق کہتے ہوئے اس پر جھپٹ پڑنا اور پھر آسندے کی خودکشی کی خبر ملنا صورتِ حال کو مزید اُلجھا دیتا ہے۔ کاستیل کی پاگل خانے میں موجودگی اور وہیں سے پاگل پن کی حالت میں

اس تمام کہانی کا بیان قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا قتل واقعی ہوا بھی ہے یا یہ ایک پاگل کے ذہن کی اختراع ہے۔ بہر حال قتل حقیقت ہو یا نفسیاتی صورتِ حال ہر دو حالتوں میں مصنف جس لغویت کو بیان کرتے ہیں بیسویں صدی کے انسان نے اس کا سامنا جاگتی آنکھوں سے کیا ہے۔ معنی سے تہی لغو دنیا میں بصیرت کا حامل انسان اس کی لغویت سے نکلنے کا راستہ نہ پا کر پہلے اجنبیت اور پھر نفسیاتی عارضے کا شکار ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(ا) رڈولف، جیمز، ڈی، Argentina a Country Study ، (یو۔ایس۔اے: لائبریری آف کانگرس، ۱۹۸۵ء)، ص: xxv

(۲) ڈونلڈ ای ووسٹر اور ویڈل جی شیفر، The Growth and Culture of Latin America، (نیویارک: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۶ء)، ص: ۲۸

"Wherever the Indians were an asset to the settlement the Indians survived; wherever they were an obstacle or of little aid they disappeared."

(۳) کیلوا ہیوکا، Country Studies Series: Agentina، (میساچوسٹس: برانڈیز یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء)، ص: ۲

"In 18175, in response to escalating attacks on colonial interests, the Minister of War Alfonso Alsina fortified settlements and dug a major trunch that extended almost 250 miles along the vast frontier that separated the territory of the federal government from those of the Mapuche Indians."

(۴) ایضاً، ص ۲

(۵) ایشکرافٹ، گرفتھ اور ٹفن، Post-Colonial Studies، (لندن: روٹلیج، ۲۰۰۰ء)، ص: ۶۹

"More importantly, introduced crops and livestock not only supported conquering armies and colonizing populations but, in what Crosby calls 'the Neo-Europes'(settler colonies),radically altered the entire ecology of the invaded lands in ways that necessarily disadvantaged indigenous peoples and annihilated or endangered native flora and fauna on which their cultures (and sometimes their very lives) depended."

(۶) بنجمن کین، Latin American Civilization، (لندن: ویسٹ ویو پریس، ۱۹۸۶ء)، ص: ۲۵۹

(۷) ایضاً، ص: ۳۲۵

"There was a prevailing belief, of colonial origin, that only men of ancient lineage were qualified to govern or hold administrative position."

(۸) لوری ایزروویراُنی، Settler Colonialism، (نیویارک: اپال گریو میکملن، ۲۰۱۰ء)، ص: ۱۷

(۹) کیلوابیوکا، Country Studies Series: Agentina، ص: ۳

"Between 1930 and 1983, fourteen militafry presidents took control of Arenatina, repeatedly staging coup d'etates and disrupting both the judiciary and legislature. When institutions were seen as hindrances to those in power, they were ignored, modified, or cynically manipulated."

(۱۰) لوری ایزروویراُنی، Settler Colonialism، ص: ۱۲

".... colonial and settler colonial forms constantly interpenetrate each other and overlap in a variety of ways."

(۱۱) ایشکرافٹ، گرفتھ اور ٹفن، Post-Colonial Studies، ص: ۳۹

"Colonial powers instituted these privileges through patronage systems that preferred and encouraged written forms over orality."

(۱۲) اکویریا اور ریو پیوا کی، ایضاً، ص: ۴۴۷

(۱۳) ایضاً، ص: ۴۴۶

"It can be said with all propriety that the Argentinian novel emerged outside of Argentina and that it did so as a consequence of the political exile imposed by the tryant Juan Manual de Rosas (1835-1852) on the educated younger generation."

(۱۴) ایضاً، ص: ۴۴۹

(۱۵) فلپ سوانسن، Latin American Fiction، (یو ایس اے: بلیک ویل، ۲۰۰۵ء)، ص: ۱۰

"In many ways it is a historical novel with much over whelming detail of life in Buenos Aires under the dictatorship and a wealth of historical characters, including Rosas himself and his deliciously wicked sister-in-law Maria Josef Ezurre."

(۱۶) اکویریا اور ریو پیوا کی، ایضاً، ص: ۴۷۲

(۱۷) ارنستو سباتو، انٹرویو، مشمولہ The August Counier، اگست ۱۹۹۰ء، ص: ۹

"I believe in art, dialogue, liberty and the dignity of the individual human being."

(۱۸) ریمنڈ لیزلی ولیمز، The Columbia Guide to the Latin American Novel Since 1945، (نیویارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء)، ص: ۳۱۰

(۱۹) ارنستو ساباتو، انٹرویو، مشمولہ The August Counier، اگست ۱۹۹۰ء، ص: ۴

(۲۰) ریمنڈ لیزلی ولیمز، The Columbia Guide to the Latin American Novel Since 1945، ص: ۳۱۰

"It is a novel of love, jealousy and murder, but the thematic focus is the pratagonist's alienation."

(۲۱) جسٹن او برین (مترجم)، The Myth of Sisyphus and Other Essays از البیر کامیو، (نیویارک: وِنتاج، ۱۹۹۱ء)، ص: ۱۵

"This world in itself is not reasonable, that is all that can be said. But what is absurd is the confrontation of this irrational and the wild longing for clarity whose call echoes in the human heart. The absurd depends as much on man as on the world. For the moment it is all that links them together. It binds them one to the other as only hatred can weld two creatures together."

(۲۲) ژاں پال سارتر، مقدمہ، Camus's Portrayal of the Absurd، مشمولہ The Stranger by Harold Bloom's Literary Criticism، ص: ۵۲

(۲۳) آصف فرخی (مترجم)، سرنگ از ارنستو ساباتو، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۶ء)، ص: ۱۵

(۲۴) ایضاً، ص: ۱۶

(۲۵) ایضاً، ص: ۱۹

(۲۶) جسٹن او برین (مترجم)، The Myth of Sisyphus and Other Essays، ص: ۱۴۔۱۵

(۲۷) ایضاً، ص: ۱۵

"In this unitelligible and limited universe man's fate hence forth assumes its meaning."

(۲۸) آصف فرخی (مترجم)، سرنگ از ارنستو ساباتو، ص: ۵۰

(۲۹) عثمان خالد (مرتب)، البیر کامیو، فکر و ادب کے آئینے میں، (کراچی: بک ہائم، ۲۰۱۶ء)، ص: ۲۴۲

(۳۰) آصف فرخی (مترجم)، سرنگ از ارنستو ساباتو، ص: ۴۶

(۳۱) ایضاً، ص: ۷۹

(۳۲) جسٹن او برین (مترجم)، The Myth of Sisyphus and Other Essays، ص: ۶

(۳۳) آصف فرخی (مترجم)، مرگ از زنستو سباتو، ص:۴۷

(۳۴) ایضاً

(۳۵) البرٹ کامیو، The Rebel: An Essay on Man in Revolt، (ونٹیج انٹرنیشنل، ۱۹۹۲ء)، ص:۹

(۳۶) ایضاً، ص:۸

(۳۷) ایضاً، ص:۱۱

(۳۸) آصف فرخی (مترجم)، مرگ از زنستو سباتو، ص:۱۲۱

(۳۹) ایضاً، ص:۹۷

(۴۰) ایضاً، ص:۲۴

(۴۱) ایضاً، ص:۲۵